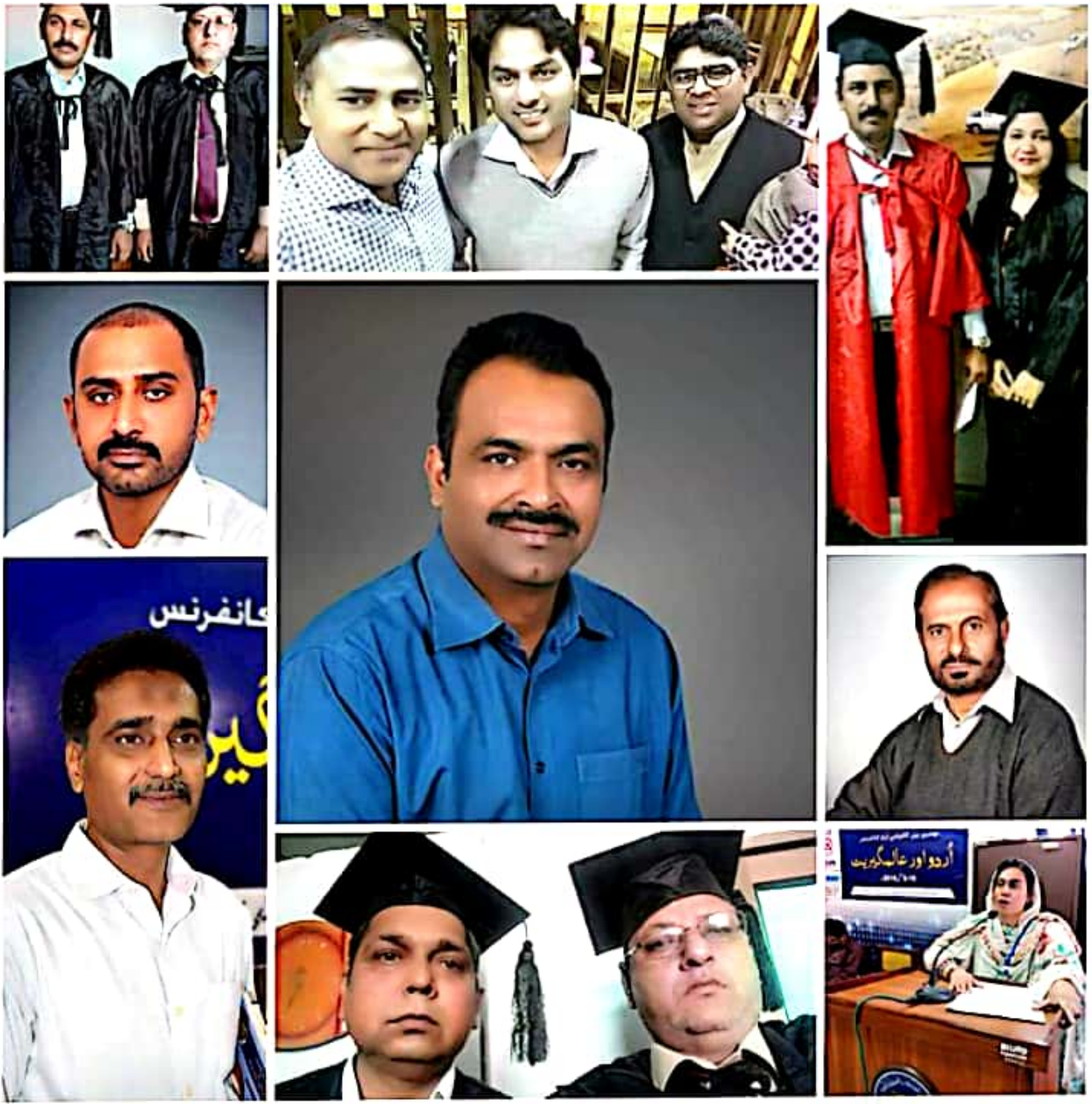

Scanned by CamScanner

نثری نظم

محمد فخر الحق نوری

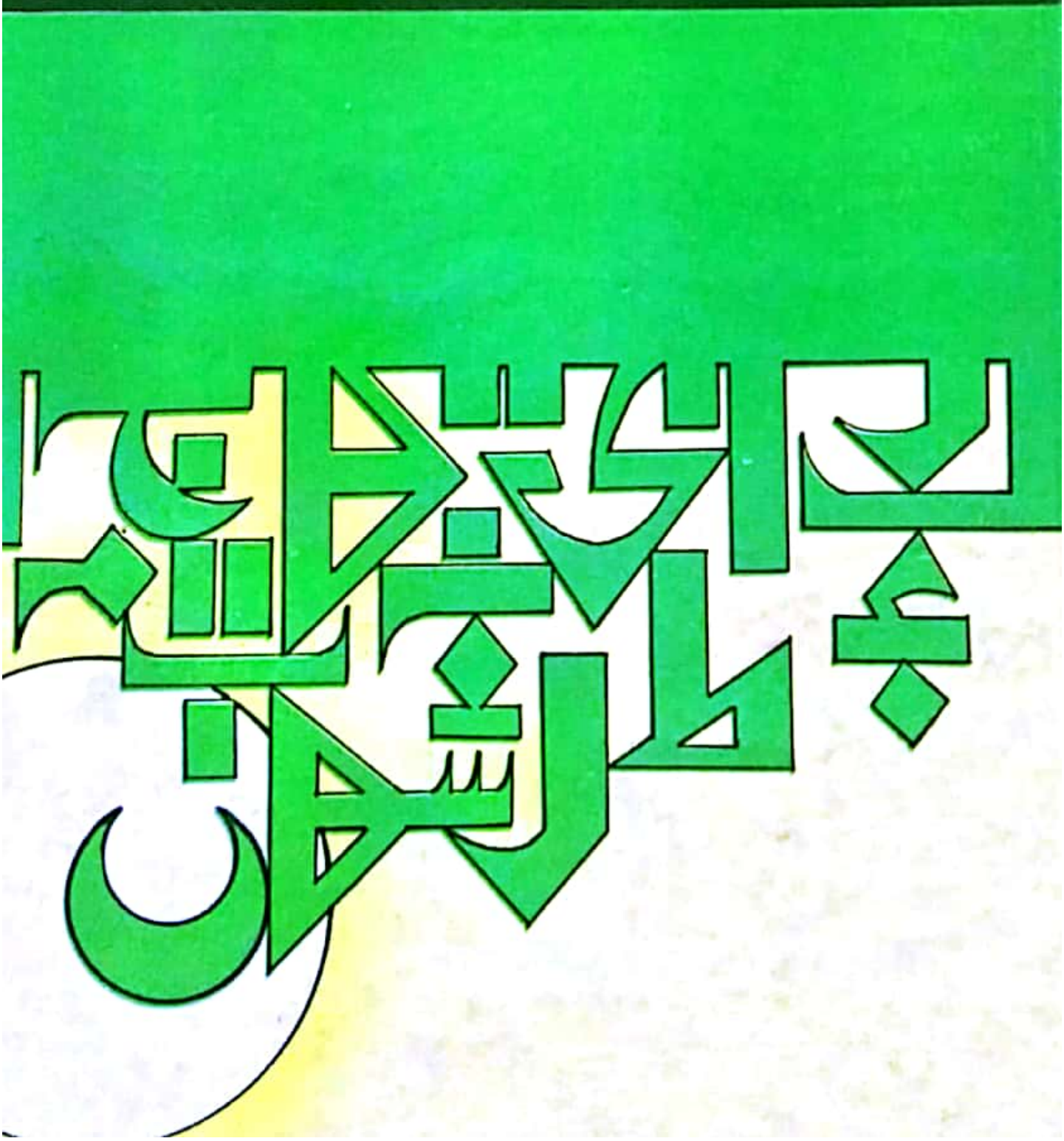

Scanned by CamScanner

حقوقِ اشاعت محفوظ

۱۹۸۹ء

تعدادِ اشاعت : ایک ہزار

نثری نظم

محمد فخر الحق نوری

ناشر : محمد جمیل النبی

سرورق : اسلم کمال

طابع : ایف ڈی پرنٹرز، لاہور

قیمت

۴۵/-

یکے از مطبوعات :

مکتبہ عالیہ

آفس : ایبک روڈ

شوروم : اردو بازار لاہور

Scanned by CamScanner

باب ۴

مُعرّیٰ نظم سے نثری نظم تک

شاعری فکر اور فن یا مواد اور ہیئت کے باہمی اتصال سے جنم لیتی ہے۔ ہر شعری تجربہ کسی نہ کسی ہیئت اور سانچے میں ڈھل کر ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ گویا ہیئت شاعر کے تجربے کی ترسیل اور افہام کا فنی ذریعہ ہے لیکن مواد اور ہیئت، دونوں کی حالت معین، جامد اور ساکن نہیں۔ ان کی حیثیت آسمانی صحیفوں کی نہیں ہے کہ ان میں تحریف و تصرف نہ ہو سکے۔ ان میں تبدیلیاں آتی ہی رہتی ہیں۔ جن کے باعث وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مروجہ شعری اصناف بھی جزوی طور پر اپنا رنگ ڈھنگ بدلتی ہیں اور نئی شعری اصناف بھی منصۂ شہود پر آجاتی ہیں۔ تغیر و تبدل کے اس عمل کے پیچھے کئی محرکات ہوتے ہیں۔ کچھ تبدیلیاں محض اس لیے ہوتی ہیں کہ انسان نظری طور پر تغیر پسند ہے اور وہ نئے پن کی تلاش میں رہتا ہے۔ کچھ تغیرات صرف رسمی اور تقلیدی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ بعض شعراء نئی چیز کو دیکھا دیکھی اپنا لیتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کے پیچھے یہ اصول کارفرما ہوتا ہے کہ "کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ"۔ لیکن شاعری میں مواد اور ہیئت کی اکثر تبدیلیاں سماجی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مواد چونکہ معاشرتی تبدیلیوں کا معتبر امین اور درخشاں مظہر ہوتا ہے اس لیے اس کے بدلنے کے ساتھ ہیئت اور سانچہ بھی بدل جاتا ہے لیکن واضح ہو کہ ہیئت کا ہر نیا تجربہ، ہر شاعر کے توسط سے نئے مواد اور نئی فکر کا علمبردار بن کر ظاہر نہیں ہوتا۔ نئی ہیئت اور نئے مواد کا باہمی تغیر کسی کسی شاعر کے ہاں ہی دکھائی دیتا ہے۔

اردو شاعری نے بھی ایسے ہی محرکات کے باعث اپنے ہر دور میں کسی نہ کسی نئے تجربے

کا خیر مقدم کیا ہے جس سے فکر و نظر اور بصیرت و آگہی کے نئے دروازے کھلے ہیں۔ اگرچہ یہ تجربات ہر عہد میں کسی نہ کسی حد تک ضرور ہوئے لیکن بیسویں صدی عیسوی اس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے آغاز سے ہی ہماری شاعری میں وسیع پیمانے پر ایسی تبدیلیاں فروغ پانے لگیں جو ہماری کلاسیکل شعری روایت سے بہت حد تک مختلف تھیں۔ ان تبدیلیوں کے ڈانڈے ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے جا ملتے ہیں۔ جب ایک دور غروب ہو رہا تھا اور دوسرا طلوع۔ تہذیبی تصادم کے نتیجے میں مغرب مشرق پر حاوی آگیا تھا۔ لوگوں کو یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ

مال وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

اس صورتحال میں مغربی اور خاص طور سے انگریزی کی تہذیبی روایات اور ادبیات کا ورود ہمارے ہاں ناگزیر تھا۔ چنانچہ بعض علماء، ادبا اور شعراء نے اس ناگزیریت کو بھانپ لیا اور جدیدیت کا علم بلند کر کے اردو شاعری کو اس کے سائے میں پروان چڑھانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان کوششوں کا نقطۂ آغاز انجمن پنجاب کا قیام ہے۔

انجمن پنجاب کے تحت اردو شاعری میں جس نوع کی جدیدیت داخل ہوئی اس کے اوّلین نمونے مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور ان کے حلقۂ متاثرین کی وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے انگریزی کی "نیچرل شاعری" کی طرز پر موضوعاتِ فطرت پر لکھیں۔ لیکن ان نظموں کا اسلوب اور ہیئت ہماری قدیم شاعری کی طرز سے مختلف نہیں۔ یہ حضرات مروجہ شعری اسالیب اور ہیئتوں سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ آزاد نے انجمن پنجاب کے پہلے اجلاس میں ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو اردو شاعری کے بارے میں یہ انکشاف کیا کہ

"تمھاری شاعری چند محدود احاطوں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو"۔

اور وہ یوں کہ:

"نئے انداز کے خلعت جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں ان صندوقوں کی

کی کنجی ہمارے وطن کے انگریزی دانوں کے پاس ہے۔" ؎

اسی شعور کے تحت انگریزی شاعری کے توسط سے اردو شاعری میں مروجہ روایتی ہیئتوں سے مختلف ہیئتیں داخل ہوئیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جدید اردو شاعری میں تمام تجربات ہی انگریزی کے زیر اثر ہوئے۔ علامہ اقبال جنھوں نے اردو شاعری کو ایک بہت بڑے فکری انقلاب سے نوازا، نے اردو کی مروجہ شعری ہیئتوں میں بھی جزوی تصرفات کیے۔ بال جبریل میں اکثر غزلیں ایسی ہیں جن میں ردیف مطلعے اور مقطعے کی پابندی نہیں کی گئی۔ اسی طرح اقبالؒ نے بعض نظموں میں تھوڑی بہت تبدیلیوں کو روا رکھا۔ ان کے علاوہ عظمت اللہ خاں نے (اور بعض دیگر شعراء نے بھی خاص طور سے گیت کی صنف میں) اوزان و بحور کے عروضی نظام کو اوزان و بحور کے پنگل نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے تجربات کیے۔ ان کے بعد حفیظ جالندھری کا نام اہم ہے کہ انھوں نے بھی بحر کی لے کی مناسبت سے موضوعات کو پیش کرنے کے متنوع تجربے کیے۔ ان تجربات کی اپنے طور پر بہت اہمیت ہے۔ لیکن انھیں عمومیت کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔

مغربی تہذیب کی آمد کے بعد انگریزی شاعری کے زیر اثر اردو شاعری میں جو تجربات ہوئے ان میں ترتیب قوافی کے لحاظ سے سانیٹ (SONNET) اور سٹینزا STANZA کی ہیئتیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اردو شاعری میں دو ایسی ہیئتیں بھی انگریزی شاعری کے حوالے سے داخل ہوئیں جن میں ترتیب قوافی کا اصول قطعی طور پر کارفرما نہیں۔ اوّل معرا نظم اور دوم آزاد نظم۔ انھیں نسبتاً زیادہ مقبولیت اور پذیرائی نصیب ہوئی۔ ان کے بعد اردو شاعری میں ایک تیسری چیز بھی آئی جو نثری نظم کہلائی۔ آج کل ہمارے بعض شعراء اس کی جانب بھی مائل ہیں۔ شاعری کے ان تینوں اسالیب یعنی معرا نظم، آزاد نظم اور نثری نظم کے ارتقائی سفر میں چونکہ ایک خاص معنوی ربط بنتا ہے، اس لیے ان تینوں کا ترتیب وار تذکرہ ہی ہمیں یہاں خاص کرنا ہے۔

معرا نظم میں وزن اور بحر کی پابندی کرتے ہوئے مصرعوں کو یکساں رکھا جاتا ہے لیکن قافیے کا التزام نہیں کیا جاتا۔ انگریزی میں یہ عام طور سے "آئمبک پنٹامیٹر" میں لکھی گئی ہے لیکن

؎ فتح محمد ملک "نئی شاعری اور جدید شاعری" "نئی شاعری" افتخار جالب، مرتب (لاہور: نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء) ص ۱۰۹

اُردو شاعروں نے کسی بحر کی تخصیص نہیں کی۔

اُردو میں معرّا نظم کا آغاز محمد حسین آزاد کے ہاتھوں ہُوا۔ انھوں نے "جغرافیہ طبعی کی پہیلی" کے عنوان سے بچوں کے لیے منشی ذکاء اللہ پروفیسر زبانہائے مشرقی کی فرمائش پر معرّا نظم لکھی۔ اس ابتدائی تجربے کا نمونہ ملاحظہ ہو: [۱]

ہنگامۂ ہستی کو — گر غور سے تم دیکھو
ہر خشک و ترِ عالم — صنعت کے تلاطم میں
جو خاک کا ذرہ ہے — یا پانی کا قطرہ ہے
حکمت کا مرقع ہے — جس پر قلمِ قدرت
انداز سے ہے جاری — اور کرتا ہے گلکاری
اک رنگ کہ آتا ہے — سو رنگ دکھاتا ہے

اس نظم کا دائرہ اثر پھیل نہیں سکا لیکن آزاد کے بعد حالی بھی جدیدیت کے اس شعور سے معمور تھے۔ اگرچہ انھوں نے کوئی معرّا نظم نہیں لکھی لیکن اس کے حق میں آواز ضرور بلند کی۔ لکھتے ہیں:

"یورپ میں آج کل بلینک ورس یعنی غیر مقفیٰ نظم کا بہ نسبت مقفیٰ کے زیادہ رواج ہے ..... جس طرح صنائع لفظی کی پابندی معنی کا خون کر دیتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ قافیہ کی قید ادائے مطلب میں خلل انداز ہوتی ہے۔" [۲]

آزاد کے بعد معرّا نظم کے لیے عملاً کام کرنے والوں میں اسمٰعیل میرٹھی کا نام آتا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے "چڑیا کے بچے" اور "تاروں بھری رات" دو معرّا نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں خاصی مقبول ہوئیں۔ خاص طور سے "تاروں بھری رات" خوبصورت معرّا نظم ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو: [۳]

ارے چھوٹے چھوٹے تارو — کہ چمک دمک رہے ہو

---

۱ "نظمِ آزاد" تبسم کاشمیری، مرتب (لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۷۸ء) ص ۱۶۶
۲ "مقدمۂ شعر و شاعری"، وحید قریشی، مرتب (لاہور: مکتبۂ جدید، ۱۹۵۳ء) ص ۱۲۷
۳ "کلیاتِ اسمٰعیل" (میرٹھ: اورینٹل پبلشنگ کمپنی، ۱۹۱۰ء) ص ۱۱۷

Scanned by CamScanner

تمھیں دیکھ کر نہ ہووے مجھے کس طرح تحیر!
کہ تم او نچے آسماں پر جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے کہ کسی نے جڑ دیے ہوں
گہر اور لعل گویا

اسمٰعیل میرٹھی نے تو معرا نظم کے لیے انفرادی کوشش کی لیکن عبدالحلیم شرر کا نام اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے نہ صرف اس ہئیت کو خود اختیار کیا بلکہ اسے فروغ دینے کے لیے باقاعدہ تحریک بھی چلائی۔ اس ضمن میں ان کے دو منظوم ڈرامے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا ڈراما شیکسپیر کے انداز میں "نظم غیر مقفیٰ" کے عنوان سے لکھا گیا جو مئی ۱۹۰۰ء کے "دلگداز" میں شائع ہوا۔ شرر نے پہلے تو اسے نظم غیر مقفیٰ کہا لیکن بعد میں مولوی عبدالحق کے مشورے سے "نظم معریٰ" لکھنا شروع کیا۔ اس ڈرامے کے پہلے سین کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو[1]

جولین
خیر یہ تمہید چھوڑو اور بتاؤ تم کہاں سے
یہاں آئے ہو۔

شخص
اے حامیٔ تثلیث و صلیب
یہ غلام ... ہے ارضِ مصر سے سیدھا ادھر

جولین
اور غرض آنے کی ؟

شخص
پر وحشت خبر

جولین
کیسی خبر ؟

شخص
جس سے سب مصری مسیحی ہیں پریشان و حزیں

جولین
کیا خبر ہے وہ ؟

شخص
کروں گا عرض خلوت میں اسے

شرر کے اس ڈرامے کو اکثر ناقدین اور محققین نے "آزاد نظم" قرار دیا ہے۔ اس منظوم ڈرامے کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے مضمون "اُردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ" میں یہ لکھا ہے کہ

---

[1] مضامینِ شرر، جلد ہفتم، (لاہور: گیلانی پریس، س۔ن) صہ ۲۲

Scanned by CamScanner

یہ آج کی اصطلاح میں "آزاد نظم" ہے[1] لیکن ہمارے خیال میں اس ڈرامے کو معرا نظم ہی کی ذیل میں رکھنا چاہیئے۔ اس میں کرداروں کے مکالموں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگرچہ مصرعوں کو توڑا اور ٹکڑوں کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ لیکن وہ مصرعے یکساں تعداد ارکان کے حامل ہیں۔ اگر کرداروں کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو مصرعوں کے لکھے گئے ٹکڑے خود بخود یکساں مصرعوں کی شکل اختیار کرتے چلے جاتے ہیں، لہٰذا اسے معرا نظم ہی سمجھنا چاہیئے۔

اس سلسلے کی دوسری کڑی شرر کا ڈراما "مظلوم ورجینیا" ہے۔ جو محولہ بالا ڈرامے کے بہت بعد میں "دلگداز" ہی میں شائع ہوا۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو[2]

آپیوس : (سخت بے باکی سے) مجھ کو کیا پروا کسی کی؟ کون ہے جو سرکشی
کر سکے گا؟ تم پکڑ لاؤ اسی دم اس کو یاں

لانجینوس: گر کوئی روکے تو کیا اس سے کہوں؟

آپیوس : اُنھ! کیا فضول
باتیں کرتے ہو؟ یہ کہہ دینا کہ یہ تو بیٹی ہے۔
میری لونڈی ہے، میری مملوک ہے مالک ہوں میں
روکنے کا حق کسے ہے؟

لانجینوس : مان لے گا کون اس
جھوٹ کو؟

آپیوس : (بگڑ کے) کیونکر نہ مانے گا؟ تمھاری باتوں میں
وہ پہنچ جائے گی اپنے مدرسے رہ جاؤ گے
میں کلیجا تھام کے۔ جاؤ پکڑ لاؤ، نہیں
تو میں مر جاؤں گا اس کے شوق میں

لانجینوس : جاتا ہوں میں

یہ ڈراما بھی اپنی ساخت کے لحاظ سے اوّل الذکر ڈرامے سے مختلف نہیں ہے لیکن اسے معرا نظم ہی کہا جاتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی اسے معرا نظم ہی قرار دیا ہے۔ اگر اس ڈرامے کو معرا نظم سمجھا گیا ہے تو معلوم نہیں ایسی ہی ساخت کے پہلے ڈرامے کو آزاد نظم کیوں قرار دیا

---

[1] "سوغات" کراچی، جدید نظم نمبر، شمارہ ۷-۸ (س۔ن) صہ ۹۱

[2] "مضامینِ شرر"، جلد ہفتم، (لاہور: گیلانی پریس، س۔ن) صہ ۷۰

گیا ہے ہماری رائے میں دونوں ڈرامے ہی معرّا نظم کی ذیل میں آتے ہیں - ان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ اور اس ضمن میں ہم اپنے مؤقف کی وضاحت گزشتہ سطور میں کر چکے ہیں۔

ان کوششوں کے علاوہ معرّا نظم کو اردو میں مقبول بنانے کے لیے اور بھی کاوشیں ہوئیں۔ اس ضمن میں نظم طبا طبائی کی ایک نظم " بلینک ورس کی حقیقت" بڑی دلچسپ ہے۔ یہ نظم، معرّا ہے اور اس میں قافیے کی پابندیوں کا مذاق اڑایا گیا ہے اور غیر مقفیٰ شاعری کو فطری شاعری کہا گیا ہے۔ شرر کی جاری کردہ یہ تحریک ان کے رسالے " دلگداز" سے سر عبدالقادر کے رسالے " مخزن" کی طرف بھی آئی۔ اور اس کے ذریعے پروان چڑھنا شروع ہوئی۔ مئی ۱۹۰۱ء کے " مخزن" میں سر عبدالقادر نے میر نذیر حسین کی نظم " چاند" پر یہ نوٹ دیا ہے :

" ہمارے مکرم میر نذیر حسین بی۔ اے نظم غیر مقفیٰ کا نمونہ ارسال فرماتے ہیں۔ یہ انگلستان کے جوانمرگ شاعر کیٹس کی نظم کا ترجمہ ہے۔" [1]

نومبر ۱۹۰۲ء میں " شہیدِ ناز" کے عنوان سے ایک منظوم ڈراما زیب النساء پر شائع ہوا۔ جس کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے :

" نظم معرّیٰ کا یہ نمونہ ہمارے لائق دوست سید علمدار حسین واسطی کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ یہ اسی طرز کی چیز ہے جو کچھ دنوں دلگداز میں انگریزی ڈراما کے ترجمے کے لیے مروج رہی ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ یہ ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد ہے۔ اور ہندوستان ہی کی سرزمین کے ایک دلچسپ قصے کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔" [2]

مخزن کے علاوہ احسن مارہروی کے رسالے " فصیح الملک" میں بھی معرّا نظم کی سرپرستی کی گئی۔ اپریل ۱۹۰۹ء کے شمارے میں " ہماری شاعری کے لیے نیا میدان" کے عنوان سے دلگیر اکبر آبادی کا مضمون شائع ہوا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں :

" انگریزی میں ایک خاص قسم کی نظم ہے جسے بلینک ورس کہتے ہیں۔ اس کا صحیح و فصیح ترجمہ نظم معرّا کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں قافیے وغیرہ کی قید نہیں رکھی

---

[1] " سوغات" کراچی، جدید نظم نمبر، شمارہ ۷-۸ (س-ن) ص ۹۰-۱۰۲

[2] ایضاً

گئی ہے کیونکہ قافیے کی قید دراصل کلام کو محدود اور طبع آزمائی کے میدان کو نہایت ہی تنگ کر دیتی ہے اور خیالات کا اظہار وسعت و آزادی سے نہیں کرنے دیتی۔"[۱]

اکبر الہ آبادی نے بھی ۱۹۱۰ء کے آس پاس معرا نظمیں لکھیں۔ وہ شرر کے خیالات سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بھی اس ہیئت میں طبع آزمائی کی۔ ان کی کلیات کے حصہ دوم اور سوم میں بلینک ورس کے چار نمونے موجود ہیں۔ ان چار نظموں میں سے ایک معرا نظم نسبتاً زیادہ اہم ہے۔ اس کے ابتدائی دو اشعار ملاحظہ ہوں:[۲]

چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر
بلا قصد ضرر اس کو ہٹایا میں نے انگلی سے
مگر وہ ایسا نازک تھا کہ فوراً پس گیا بالکل
نہایت ہی خفیف اک داغ کاغذ پر رہا اس کا

ان کوششوں کے بعد بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے اپنی ادارت میں نکلنے والے رسالے "ہمایوں" کے ذریعے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ جنوری ۱۹۲۳ء کے "ہمایوں" میں ان کا معرکہ آرا مقالہ "اردو شاعری اور بلینک ورس" شائع ہوا جس سے ان کی تحریک نے عملی صورت اختیار کی۔ اس مقالے میں تاجور نے بلینک ورس کی خوبیاں بیان کی ہیں اور مختلف زبانوں کی شاعری سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ تاجور لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں بے قافیہ نظموں کو رائج کرنا اردو نظم کی گرانقدر اصلاح ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ انجمن ارباب علم پنجاب اور رسالہ ہمایوں کے ذریعے اردو نظم میں بلینک ورس کو رواج دوں۔"[۳]

چنانچہ خلیل الرحمٰن اعظمی کی تحقیق کے مطابق صرف ۱۹۲۳ء میں مندرجہ ذیل بے قافیہ نظمیں "ہمایوں" میں شائع ہوئیں۔

---

[۱] سوغات کراچی، جدید نظم نمبر، شمارہ ۷-۸ (س۔ن) ص ۹۰-۱۰۲

[۲] خواجہ محمد زکریا، اکبر الہ آبادی، (مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی پنجاب یونیورسٹی لائبریری س۔ن) ص ۳۲۴

[۳] سوغات کراچی، جدید نظم نمبر، شمارہ ۷-۸ (س۔ن) ص ۱۰۴-۱۰۶

Scanned by CamScanner

مشرق کا پیام اخوت مغرب کے نام ۔ تاجور نجیب آبادی
پیام صبح ۔ اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی
کوہ ایورسٹ سے خطاب ۔ وتستہ پرشاد فدا بی ۔ اے
سارناتھ ۔ سید حسین
آبشار ۔ سید ابو محمد ثاقب کانپوری
یہی جی چاہتا ہے اور جی لیں ۔ امین حزین سیالکوٹی
وقت کی ڈبیا ۔ حامد اللہ افسر میرٹھی

چوتھی دہائی میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس ضمن میں م۔ حسن لطیفی کی معرّا نظم "مہتاب زمستان" اہم ہے جو ان کی کتاب لطیفیات میں شامل ہے۔[۲] اس کے بعد اس سلسلے کا سب سے اہم نام یوسف ظفر کا ہے جنھوں نے ۱۹۴۰ء کے بعد دو تین سال کے عرصے میں بہت سی معرّا نظمیں لکھیں۔ ان کی کتاب "زنداں" میں بیس بائیس معرّا نظمیں شامل ہیں۔ ایک نظم "سہاسا" کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔[۳]

کھڑکیاں بند کرو سرد ہوا آتی ہے!
کوہساروں کی سسکتی ہوئی بے مہر ہوا!
کپکپا دیتی ہے اس ظلمتِ شب میں مجھ کو!
منجمد کرتی چلی جاتی ہے میرے دل کو!
میرے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں میں سکت اتنی نہیں
کھڑکیاں بند کروں سرد ہوا آنے نہ دوں!!

اثر لکھنوی اور دیگر لوگوں نے بھی معرّا نظمیں لکھیں، لیکن یہ سلسلہ شدّ و مدّ کے ساتھ جاری نہ رہ سکا اور جلد ہی معرّا نظم پر آزاد نظم کا ایسا غلبہ ہوا کہ معرّا نظم لکھنے کا سلسلہ قریباً رک گیا۔

---

[۱] "سوغات، کراچی"، جدید نظم نمبر، شمارہ ۷-۸ (س-ن) ص ۱۰۴-۱۰۶
[۲] م۔ حسن لطیفی "لطیفیات" جلد دوم (لدھیانہ: ۱۹۳۵ء) ص ۵۴
[۳] یوسف ظفر، "زنداں" لاہور (اردو بکسٹال، ۱۹۴۴ء) ص ۳۳

Scanned by CamScanner

آزاد نظم میں معرّا نظم کے برخلاف مصرعوں کا یکساں ہونا بھی ضروری نہیں۔ اس میں بحر تو ایک ہی اختیار کی جاتی ہے لیکن مصرعوں میں بحر کے ارکان کی تقسیم شاعر کی صوابدید پر ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک رکن دو مصرعوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اردو شاعری میں اس کی آمد بھی انگریزی کی وساطت سے ہوئی۔ اس کا آغاز تو معرّا نظم کے کافی عرصہ بعد ہوا لیکن اسے فروغ معرّا نظم کے ساتھ ہی ملا۔ معرّا نظم کا رجحان جلد ختم ہو گیا اور آزاد نظم کی مقبولیت میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور یہ طرزِ شاعری تا حال مقبول ہے۔

اردو شاعری میں آزاد نظم کا اوّلین نمونہ "نظم غیر مقفیٰ" کے نام سے چھپنے والے شررؔ کے ڈرامے کو سمجھا جاتا ہے لیکن جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں یہ واضح کر چکے ہیں اس ڈرامے کو معرّا نظم سمجھنا چاہیئے۔ تاہم اردو شاعری میں آزاد نظم کا آغاز کرنے والے عبدالحلیم شررؔ ہی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظم "سمندر" دیکھی جا سکتی ہے۔ جو ان کے رسالے "دلگداز" میں فروری ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی:[1]

اے سمندر! میرے دل کی طرح تجھ میں بھی یہ جوش
کس لیے پیدا ہے؟
یہ دیوانگی کیوں؟
منہ میں کف
کیوں بھر آتا ہے تیرے
کیا کسی
عارضِ گلگوں کا دیوانہ ہے تو بھی
سچ بتا
ورنہ یوں سر کو پٹکنا اور دے دے مارنا
پتھروں پر
غیر ممکن تھا، مگر

---

[1] "سوغات کراچی"، جدید نظم نمبر، شمارہ ۷-۸ (س-ن) صد ۱۱۴

عشق ! پراندوہ عشق
ظلم سے تیرے بچا ہے کوئی بھی
کہسار سے
بہہ رہی ہیں آنسوؤں کی ندیاں
اور آندھیاں
خاک اڑاتی پھرتی ہیں
اور تو اے آسماں
ماتمی پوشاک پہنے ہے خود اپنے سوگ میں
اور تارے گویا انگارے ہیں جن پر لوٹتی ہے یہ نظر
میری امیدوں کو لے کر
بے قراری اور بے تابی کے ساتھ

شررؔ نے "دلگداز" میں جدیدیت کی جو تحریک چلا رکھی تھی اور ساتھ ہی ساتھ معرّا نظم میں ڈرامے وغیرہ لکھے تھے۔ ان کے زیرِ اثر آزاد نظمیں لکھنے کا رجحان پیدا ہونے کے لیے راہ ہموار ہو گئی تھی۔ معرّا نظم سے اگلی سیڑھی آزاد نظم تھی۔ چنانچہ شررؔ کے تجربوں سے متاثر ہو کر قیصر بھوپالی نے "کرشمۂ عشق" کے عنوان سے آزاد نظم میں ایک منظوم ڈراما لکھا جو "کمال" دہلی میں شائع ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اور لوگوں نے بھی آزاد نظمیں لکھیں۔ مثلاً جون ۱۹۲۷ء کے "ہمایوں" میں اشتیاق حسین قریشی کی نظم "درسِ فطرت" شائع ہوئی۔ اسی طرح جولائی ۱۹۳۴ء کے "ہمایوں" میں حفیظ ہوشیار پوری کی نظم "بے وفائی" شائع ہوئی۔ جس پر یہ تعارفی نوٹ لکھا گیا :

"بے وفائی لارڈ بائرن کی مشہور نظم WHEN WE TWO PARTED کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ VERSELIBRE یا آزاد نظم میں ہے جو دورِ جدید کی انگریزی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔" [1]

آزاد نظم کے ان ابتدائی تجربوں سے حوصلہ پا کر جس شاعر نے اس ہیئت کو فروغ دینے کیلئے

---

[1] "سوغات کراچی" (جدید نظم نمبر، شمارہ ۷ ـ ۸ (س ـ ن) ص ۹۳ ـ ۱۱۰

اولین قابلِ ذکر کوششیں کیں وہ تصدق حسین خالد ہیں۔ انھوں نے دو شعری تصانیف "سرودِ نو" اور "لامکاں تا لامکاں" چھوڑی ہیں جن میں بے شمار آزاد نظمیں موجود ہیں۔ یہ آزاد نظمیں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان میں لکھی گئیں۔ یہاں ہم صرف ایک آزاد نظم بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:[1]

کیفِ بہار

بہار،
اپنی شوکتوں، مسرتوں کے ساتھ
آگئی،
جہانِ زندگی پہ ایک موجِ رنگ بن کے چھا گئی
ہر ایک مردہ شے میں برق سی حیات کی تڑپ گئی
ہر ایک زندہ شے میں حسنِ بے مثال رقص کر اٹھا۔
وہ پھول،
خوشنما، نشاط بیز پھول،
اڑنے لگ پڑے!
وہ پھول جیسی شوخ تتلیوں سے اک جہاں مہک اٹھا!
کہو تو ان میں کون تتلیاں ہیں
اور کون پھول ہیں؟
بہار
ہاں بہار کی نشاط خیز رُوح کی قسم
مجھے تو کچھ خبر نہیں۔

تصدق حسین خالد کے بعد میراجی نے بھی اردو شاعری میں دیگر ہیئتوں کیساتھ ساتھ آزاد نظم کو اپنایا اور اس کے ارتقاء میں حصّہ لیا۔ اس سلسلے میں "میراجی کی نظمیں" اور "تین رنگ" میراجی کے لیے مجموعے ہیں جن میں کئی آزاد نظمیں ہیں۔ لیکن ان آزاد نظم نگاروں کے علاوہ دو شاعر ایسے ہیں جنھوں نے آزاد نظم

---

[1] "لامکاں تا لامکاں" (کراچی: نصرت پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء) صـ ۱۳-۱۴

راشد
میراجی

..

اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگزاروں سے صدا آنے لگی
ظلم پروردہ غلاموں! بھاگ جاؤ
پردۂ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آورد کو
حیلۂ شب خوں بناؤ۔

یہ آزاد نظم اور راشد کی ایسی ہی بہت سی دوسری آزاد نظمیں بہت مسحور کن ہیں۔ ان کا تاثر بھرپور ہے۔

مجید امجد کے دو شعری مجموعوں "شب رفتہ" اور "شب رفتہ کے بعد" کا ذکر بھی یہاں ناگزیر ہے۔ ان میں بہت سی آزاد نظمیں موجود ہیں جو فنی حسن کی رفعتوں کو چھو رہی ہیں۔ ان کا عہدِ تصنیف بھی کم و بیش وہی ہے جو راشد کی نظموں کا ہے۔ مجید امجد کی آزاد نظموں میں سے یہاں ہم صرف ایک نظم کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔[1]

"یہ سر سبز پیڑوں کے سائے"

سیہ تنگ تپتی سڑک پر، یہ سر سبز پیڑوں کے سائے
ہوا اس جگہ کتنی ٹھنڈی ہے جھونکوں پہ سایوں کے دھبّے بھی ہیں کتنے ٹھنڈے
درختوں کے اس جھنڈ سے جب میں گزرا
خنک چھاؤں کی ٹکڑیاں سی مرے جسم پر تھرتھرائیں،
مرے جسم سے گر کے ٹوٹیں
عجب اک اچھوتی سی ٹھنڈک مری روح میں سرسرائی
سہانے دنوں کی انوکھی سی ٹھنڈک
وہ دن کتنے اچھے تھے جب ایک بھیگی ہوئی سانس کی ریشمی رو

---

[1] "ان گنت سورج"، خواجہ محمد زکریا، مرتب، (لاہور: ضیائے ادب، ۱۹۷۹ء) ص ۶۹-۶۹

مرے دل کی چنگاریوں کے پسینے سے مس تھی!
وہ مبہم سی خوشیاں جو چھپ چھپ کے ہر موڑ پر نت نئے بھیس میں
آ کے روحوں سے ملتی ہیں، مل کر بچھڑتی ہیں، جیسے
ہواؤں پہ سایوں کے چھدرے سے دھبے،
فضاؤں میں صد ہا سفید و سیاہ آفتابوں کے بکھرے سے ریزے،
سرِ خاک بے ربط، بے سطر خاکے
یہ سب کچھ، بس اک دو قدم تک
پھر آگے وہی دھوپ، شاداب دردوں کی جانب سمکتی ہوئی،
سنگریزوں پہ بہتی ہوئی، دھوپ
حدِ عدم تک!

⁂

ان شعرا کے علاوہ بھی بے شمار شاعروں نے آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ اور تا حال لکھ رہے ہیں۔ ان میں سردار جعفری، فیض، مصطفےٰ زیدی، مختار صدیقی، قیوم نظر، یوسف ظفر، جیلانی کامران، منیر نیازی، احمد ندیم قاسمی، عرش صہبائی، عارف عبدالمتین، علی سردار جعفری، ضیا جالندھری، وزیر آغا، اطہر نظر وغیرہ شامل ہیں۔ جدید تر دور کے آزاد نظم لکھنے والوں میں خصوصاً وحید اختر، اعجاز فاروقی، عادل منصوری، مخمور سعیدی، ساقی فاروقی، غلام جیلانی اصغر، امجد اسلام امجد، افتخار نسیم، انور مسعود، تبسم کاشمیری، سہیل احمد، خورشید رضوی، سلیم بے تاب، انور محمود خالد، ریاض مجید، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، صائمہ خیری، عرفانہ عزیز، ذوالفقار احمد تابش، اظہر جاوید، احسن زیدی، اختر حسین جعفری اور بہت سے دوسرے شاعر شامل ہیں۔ ان کی وساطت سے آزاد نظم موجودہ دور میں بھی پورے اعزاز کے ساتھ محوِ سفر ہے۔

معرا نظم میں قافیے کی پابندی ترک کی گئی۔ آزاد نظم میں قافیے کے ساتھ، مصرعوں میں بحر کے ارکان کی یکساں تعداد کے اصول کو بھی چھوڑ دیا گیا۔ صرف رکن کو بنیاد تسلیم کیا گیا۔ لیکن اس سے اگلی سطح پر نثری نظم میں "رکن" کی حاکمیت سے بھی انکار کر دیا گیا اور صرف "لفظ" کی بنیاد پر شاعری

Scanned by CamScanner

کی گئی۔ اوزان و بحور کے کسی مروجہ نظام کی پیروی نہ کرنے کے لحاظ سے نثری نظم مروجہ شعری ہیئتوں کی موجودگی میں بے ہیئتی کی ہیئت بھی کہلائی لیکن حقیقت یہ ہے کہ نثری نظم شعری ہیئت ہی کا ایک جدید تجربہ ہے کیونکہ ہر لفظ اپنے طور پر کسی نہ کسی مجرد جذبے، احساس اور کیفیت کی ہیئت ہوتا ہے۔

نثری نظم لکھنے کا رجحان، آزاد نظم کے بہت بعد ہوا۔ اس لیے اردو میں اس کی آمد کو مزید آزادی کے حصول پر محمول کیا جاتا ہے۔ انیس ناگی لکھتے ہیں:

"یہ شاعری کسی لبریشن کی ایک کوشش ہے، یہ ایک اسلوب شعر سے دوسرے کی طرف جانے کا سفر ہے۔"[۱]

عارف عبدالمتین نے بھی ایک انٹرویو میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے:

"نثری نظم موجودہ اصناف سخن کا منطقی نتیجہ ہے اگر ہم تاریخی تناظر میں اصناف سخن کا جائزہ لیں تو ہم پر کھلے گا کہ ہم سالہا سال تدریج کے ساتھ نثری نظم تک پہنچے ہیں اور درمیانی مراحل میں نظم پابند، نظم معریٰ اور نظم آزاد ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اور اب نثری نظم آئی ہے۔ اس تدریج کو ہم ..... حریت فکر کے تدریجی فروغ کا نام بھی دے سکتے ہیں۔"[۲]

مخدوم منور نے بھی کم و بیش اسی خیال کو ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"نثری نظم آزاد نظم کا منطقی نتیجہ ہے۔ یعنی مزید آزادی، آج کا شاعر محسوس کرتا ہے کہ وہ نظم آزاد میں بھی مکمل اظہار نہیں کر سکتا۔"[۳]

ان آرا سے ہمیں جزوی اتفاق ہے۔ یہ بجا ہے کہ نثری نظم مزید آزادی کی مظہر ہے لیکن یہ بات ناقابل قبول ہے کہ نثری نظم ہمارے یہاں اس لیے آئی کہ آج کا شاعر آزاد نظم میں اپنا مکمل اظہار نہیں کر سکتا یا نثری نظم کے علاوہ جتنی بھی اصناف شاعری ہیں ان کا حریت فکر سے

Scanned by CamScanner

نسبتاً کم تعلق ہے۔ حریت فکر کی نثری نظم کے ساتھ تخصیص نہیں کی جاسکتی۔ اگر ایسا ہی ہو تو پھر پابند نظم، خصوصاً غزل جو آج بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ زندہ ہے، اور آزاد نظم کا وجود نہ رہے۔ جب کہ غزل اور آزاد نظم نثری نظم سے کہیں زیادہ لکھی جارہی ہے۔ دراصل کسی نئی ہیئت کے آنے کا مطلب یہی نہیں ہوتا کہ باقی تمام اصناف کے امکانات ختم ہوگئے ہیں اور نیا شاعر پرانی شعری اصناف میں اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کرسکتا۔ اقبال نے اپنی عالمی شہرت یافتہ مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی بیسویں صدی میں لکھی۔ جب مثنوی لکھنے کا رواج بہت کم ہوگیا تھا۔ لیکن انھوں نے اس میں پورا نظام فکر پیش کردیا ہے۔ ایک ایسا نظامِ فکر جو جدید و قدیم علوم سے مربوط ہے۔ اس مثال سے یہ وضاحت مقصود ہے کہ اردو میں نثری نظم کی آمد کا یہ مطلب نہیں کہ باقی اصناف کی قدر و قیمت کھوگئی ہے۔ یہ تو شاعر پر منحصر ہے کہ وہ کس صنف کو کہاں تک رفعت عطا کرتا ہے۔

اردو میں نثری نظم بھی، معرا نظم اور آزاد نظم کی طرح مغرب کے توسط سے داخل ہوئی۔ یورپ میں جب اوزان و بحور کی شاعری کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا تو وہاں نثری نظم لکھی گئی اور ہمارے شعرا نے مغرب کے اس نئے شعری تجربے کے وسیع امکانات کا اندازہ کرکے اسے اپنے شعری ادب میں داخل کیا۔ گو انیس ناگی وغیرہ نے یہ لکھا ہے کہ اردو میں نثری نظم کا آغاز شاعری کی اندرونی ضرورت کے طور پر ہے کہ وہ بہت سی ادبی و شعری بدعتیں جو ایک فرد کی رسم اور ضابطے کی شکل میں ادراک اور اظہار میں حائل ہوتی ہیں انھیں خیرباد کہنا ضروری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نثری نظم کی اردو شاعری میں آمد بہت حد تک تقلیداً ہوئی اور مغرب خاص طور سے فرانس کے شعری ادب کے اثرات اس کے محرک بنے۔ اس کا ثبوت، وہ تراجم بھی ہیں جو بعض لوگوں، مثلاً خود انیس ناگی، نے راں بو اور دوسرے نثری نظم نگاروں کی نظموں کے کیے ہیں۔ اگرچہ ہمارے نثری نظم نگاروں، خاص طور سے نوجوانوں، کی اکثریت کے ہاں فرانس کے مشہور و معروف نثری نظم نگاروں

Scanned by CamScanner

کے اثرات عملی طور پر دکھائی نہیں دیتے لیکن یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ ان کے سامنے مثالی نمونہ فرانسیسی نثری نظموں کا ہی ہے[1]

---

[1] یوں تو یورپ میں نثری نظم کافی مدت سے لکھی جا رہی ہے اور اس کے ابتدائی نقوش اٹھارویں صدی عیسوی میں فرانس کی ادبی تخلیقات میں مل جاتے ہیں لیکن اس کی باقاعدہ ابتدا انیسویں صدی عیسوی میں فرانس ہی میں ہوئی۔ فرانسیسی ادبی رائے عامہ نے اس نئی صنفِ شاعری کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ ہر چند نثری نظم کو پروان چڑھانے والوں میں موریس ڈگیرین MAURICE DEGUERIN الفونس ریب ALPHONESE RABBE لوترمون LAUTR'AMONT راں بو RIMBAUD اور ملارمے MALLARME وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں لیکن فرانسیسی ادبی تاریخ میں بودلیئر BAADELAIRE پہلا شخص ہے جس نے نثر کے شعری امکانات کا پورا احساس کر کے اسے جدید شاعری کی ہیئت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

(لئیق بابری "بودلیئر کی نثری نظم" "ماہِ نو" شمارہ ۶ (جون ۱۹۷۹ء صد ۱۰-۱۱)

بادلیئر کی شاعری کا ایک بڑا حصہ نثری نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کے مجموعے پیٹیس پوئمز ان پروز PETITS POEMS EN PROSE مطبوعہ ۱۸۶۹ء میں قلمزد کر دینے کے قابل کوئی چیز نہیں بلکہ اس مجموعے نے بادلیئر کی بحیثیت شاعر عظمت کو استحکام بخشا ہے۔ اسی طرح راں بو کی شاعرانہ عظمت کا راز بھی اس کی نثری نظمیں ہی ہیں۔ راں بو کی شہرت اور عظمت اس کی نثری نظموں کے مجموعے ILLUMINATIONS مطبوعہ ۱۸۸۶ء کی وجہ سے ہے۔ اس کے علاوہ ملارمے کے مجموعے DIVAGATIONS میں بھی متعدد نثری نظمیں ہیں جو اس کی اچھی شاعری میں شمار ہوتی ہیں۔

[وہاب اشرفی، "نثری نظم" رسالہ "نئی قدریں" (ہندوستان: رانچی یونیورسٹی س۔ن) صد ۱۰۸]

ان شعراء اور بعض دیگر شعراء کی وساطت سے اس نئی روایت نے دنیا کے دیگر خطوں کی طرف جلد ہی رُخ کیا۔ بیسویں صدی میں مغرب میں لکھی جانیوالی نثری نظم میں سب سے اہم کارنامہ سینٹ جان پرس کی نظمیں ہیں۔ جو اپنے فلسفیانہ اور تاریخی موضوعات، زبان و بیان کے شکوہ، مختلف علوم جدیدہ کی شمولیت اور کثیر المعانی ہونے کے اعتبار سے زبان کی ایک انتہا کو پیش کرتی ہیں۔

[انیس ناگی، نثری نظمیں۔ (لاہور: مکتبۂ جمالیات، ۱۹۸۱ء) صد ۳۴]

Scanned by CamScanner

فرانسیسی نثری نظموں کے علاوہ اردو میں نثری نظم نگاری کا دوسرا ابتدائی محرک رابندر ناتھ ٹیگور کی بعض تصانیف مثلاً گیتان جلی ہیں[۱]۔ ٹیگور کی تقلید میں بعض لوگوں نے رام بابو سکسینہ کی اصطلاح میں "خیالی اردو" یا "ٹیگوری اردو" لکھنا شروع کی[۲]۔ ان مقلدین میں جوش ملیح آبادی کا نام سرِ فہرست ہے جنھیں دورِ حاضر کے بعض نثری نظم نگار، اوّلین نثری نظم نگار شمار کرتے ہیں[۳]۔ جوش کا اوّلین مجموعہ کلام موسوم بہ "روحِ ادب" پہلی بار ۱۹۲۰ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ جس کے آخر میں لگ بھگ پینتالیس[۴۵] مبینہ نثری نظمیں شامل ہیں۔ اگر انھیں نثری نظمیں تسلیم کر لیا جائے تو دو چیزیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جوش ملیح آبادی ابتدائی نثری نظم نگار ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ انھوں نے ٹیگور کے اثرات قبول کیے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے "روحِ ادب" کے دیباچہ میں خود تسلیم کیا ہے:

"اس مجموعے میں نثر بھی ہے، غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ نثر کی جانب ٹیگور نے مجھے مخاطب کیا تھا....."[۴]

اس بیان سے جہاں ٹیگور کے اثرات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے وہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جوش نے محولہ فن پاروں کو صرف "نثر" قرار دیا ہے۔ وہ انھیں نثری نظم کا نام نہیں دیتے اور نہ انھیں شاعری ہی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک شاعری محض "پابند" ہی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ سمجھتے تو ایک آدھ آزاد نظم ہی لکھی ہوتی۔ "نثر" میں لکھے گئے فن پاروں کو جوش نے "مضامین" کا نام بھی دیا ہے اور ان کے آغاز میں کہیں کہیں ابیات بھی درج کیے ہیں۔ "تازہ پھول" کے عنوان سے

۱۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی "گیتان جلی" کے بہت سے اردو تراجم ہو چکے ہیں ان میں نیاز فتحپوری کا ترجمہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے جو انھوں نے "عرضِ نغمہ" کے نام سے کیا۔ یہ نگار پاکستان، کراچی سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۰۳ فن پارے موجود ہیں۔ ہم نے اسے اپنا موضوع اس لیے نہیں بنایا کہ ہمارے نزدیک ترجمہ اور تخلیق، الگ الگ چیزیں ہوتی ہیں۔

۲۔ "تاریخ ادب اردو"، مرزا محمد عسکری، مترجم (لاہور: علمی کتاب خانہ، سن ندارد) ص ۵۵۴

۳۔ "روزنامہ جنگ"، لاہور

۴۔ جوش ملیح آبادی۔ "روحِ ادب" طبع دوم (لاہور: مکتبۂ اردو ۱۹۴۲ء) ص ۱۴

شروع ہونے والے اس باب کے آغاز میں جوش نے جو تعارفی نوٹ دیا ہے وہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک شاعری پابند نظم کے ساتھ ہی مخصوص ہے اور وہ 'نثر' اور 'شاعری' میں التزاماً فرق روا رکھتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

"یہ وہ مضامین و اشعار ہیں۔ جو آغازِ موسمِ بہار یعنی مارچ میں لکھے گئے ہیں اور ایسے پھول ہیں جن کی پنکھڑیوں سے شبنم ابھی اڑی نہیں ہے۔" [1]

مختصر یہ کہ جہاں یہ بات قابلِ قبول ہے کہ ابتداء رابندر ناتھ ٹیگور کے زیرِ اثر جوش کے قلم سے نثری نظمیں معرضِ تحریر میں آئیں وہاں اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جوش نے شعوری طور پر "نثری نظمیں" نہیں لکھیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی جو اچھی نثری نظموں میں ہونی چاہیئے۔ ان کا انداز بیانیہ ہے اور ان میں خطابیہ عناصر بھی وافر ہیں۔ نمونے کے طور پر "راز" ملاحظہ ہو: [2]

"میری آنکھ کے آخری پردہ میں تیرا تبسم چھپا ہوا ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ جب کبھی میری آنکھ سے کسی کے سامنے آنسو نکل پڑتا ہے تو تیرے تبسم کے نقوش دھندلے ہونے لگتے ہیں اور جب میں خلوت میں آنسو بہاتا ہوں تو ان نقوش تبسم میں جلا آنے لگتی ہے۔ شاید تو وہ راز ہے جسے افشا ہونے سے بہت ہی شرم آتی ہے۔"

فیض احمد فیض نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ جن فن پاروں کو آج کل 'نثری نظمیں' کہا جاتا ہے۔ ویسی ہی تحریریں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے دوران میں رسالہ 'نگار' اور رسالہ 'رومان' میں شائع ہوتی رہی ہیں [3] ہمیں یہ رسائل تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکے۔ لہٰذا ان میں چھپنے والی تحریروں کے بارے میں رائے دہی کا حق ہم کسی آئندہ محقق کو دیتے ہیں۔

نثری نظم کے نسبتاً زیادہ واضح نقوش اسی دور کے ایک ادبی جریدے "نیرنگ خیال" میں ملتے ہیں جو لاہور سے شائع ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد "نیرنگ خیال" کے پرچوں میں بعض لوگوں کی طبع زاد

---

[1] جوش ملیح آبادی، "روحِ ادب" (لاہور: مکتبۂ اردو، ۱۹۴۲ء) صہ ۱۴۲

[2] ایضاً صہ ۱۴۴

[3] "جنگ" لاہور، ۱۵ر فروری ۱۹۸۳ء

اور اخذ و ترجمہ شدہ تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان تحریروں کا انتخاب بھی شائع ہوا۔ اگرچہ یہ تحریریں انشائے لطیف، ادبِ لطیف، جواہر پارے اور ذرّاتِ درخشاں وغیرہ کے نام سے شائع ہوتی تھیں لیکن اس دور میں نثری نظم کا شعور موجود تھا۔ غلام عباس کی ایک تحریر "چشمہ" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس پر یہ الفاظ زیرِ عنوان کے طور پر تحریر ہیں ــــ آسکر وائلڈ کی ایک نظمِ منثور کا ترجمہ۔ بلاشبہ ان تحریروں میں سے اکثر تحریریں ایسی ہیں جنھیں شاعری کی ذیل میں نہیں رکھا جا سکتا لیکن بعض تحریریں اپنی شعریت کی بنا پر نثری نظم کا ابتدائی نمونہ کہلانے کی سزاوار ہیں۔ ان میں بنیادی عقلی اور بنیادی جذباتی رویے کے حوالے سے امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ تاثیر کی تحریریں "دوشیزگی" اور "آخری گیت" شعریت کی حامل ہیں۔ آخری گیت ملاحظہ ہو:[1]

روپہلی پروں والا راج ہنس اپنا آخری گیت گا رہا ہے۔
چاند کی کرنیں یاسمین کے پھولوں میں سے چھن چھن کر جھیل کی لہروں کو ساکن کر رہی ہیں
شاخوں کا نیلگوں سایہ چاندنی کو فروزاں کر رہا ہے
رنگوں پر روشنی کی نیند طاری ہو گئی ہے۔
راج ہنس نے اپنے روپہلی پر پھیلا دیے ہیں
اور اس کے بے صدا نغمے ہر بُنِ مُو سے پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگے ہیں
یاسمین کی پتیوں نے جھیل کے پانی کو ڈھانپ لیا ہے۔
اور چاند کی کرنیں سمٹ سمٹ کر رہ گئی ہیں
روپہلی پروں والا راج ہنس اپنا آخری گیت گا چکا ہے ــــ

اسی طرح انیس مجتبیٰ کی تحریر "تبسم" بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ تاثیر اور انیس مجتبیٰ وغیرہ کے بعد م۔ حسن لطیفی کا نام آتا ہے۔ ان کی ایک چھوٹی سی کتاب "نکہتِ رائیگاں" ایسی ہی تحریروں پر مشتمل ہے۔ م۔ حسن لطیفی نے تو دعویٰ بھی شاعری ہی کا کیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر لکھا ہے:

"شعرِ منثور اور انشاءِ لطیف کے دو درجن سے زائد طبعزاد اور ترجمہ شدہ پارہ ہائے ادب"۔

[1] محمد یوسف حسن، مرتب، "پنکھڑیاں" (لاہور: رفیقِ عام پریس، ۱۹۲۹ء)، ص ۲۶ تا ۲۴

اس عبارت میں "شعرِ منثور" کا ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ مجموعی طور پر اس کتابچے میں ستائیس فن پارے شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ فرانسیسی نثری نظموں سے ماخوذ ہیں اور کچھ طبع زاد ہیں۔ ایک طبع زاد نثری نظم ملاحظہ ہو:[1]

"کمسن بہار میں"

کسی غنچۂ دوشیزہ کی تہہ بہ تہہ لپٹی ہوئی پنکھڑیوں میں
جب کہ
کوئی لطیف و سبک شمیم
محوِ خواب ہو
اور کہیں دور سے
آنے والی نسیمِ آوارہ کے شوخ جھونکے
اس نگہتِ آسودہ کو چھیڑ چھیڑ کر ایک ہلکی سی سرسراہٹ سے فضا میں تموج پیدا کر رہے ہوں۔
تو
شاعر جس کے لیے خاموشی بھی
ایک آوازِ بے آواز ہے
ہوا کی ان مرتعش لہروں میں ایک مخصوص پیغام سنتا ہے
اس کے نزدیک یہ مبہم سا اہتزاز
ایک پرمعنی نغمۂ بیداری ہے
گویا نسیم بوئے خوابیدہ کی خواب گاہ کے نزدیک موسیقانہ زیر و بم سے دبی آواز میں یہ گا رہی ہے
"رنگ و بو کی ایک ایسی نازک گرہ میں جس کو وا ہو کر پھول بننا ہے، پنہاں ہونے والی نازنین
میں تیری بیداری کا ترانہ گانے کے لیے آئی ہوں۔
اس گہرے خواب سے جاگ
اور دیکھ

---

[1] م۔ حسن لطیفی، "نگہتِ رائیگاں" (لاہور: ۱۹۳۵ء) صـ۱۶

تیری پذیرائی کے لیے میرا دامن شوقِ فراواں سے کہاں تک بالیدہ ہوا جارہا ہے۔
تیری پرواز کی وسعتیں ضبطِ جنبش تک سمٹی رہیں گی
اگر
تُو چاہتی ہے کہ تیری فطری لطافتیں تجھے ابھار دیں
تو
خمارِ دوشین کے عالم میں ایک ایسی کافر انگڑائی لے
کہ
تیری پرواز میں حائل ہونے والی برگِ گل کی نازک پتیاں شگفتہ ہو کر رہ جائیں
اور
تُو
میری موجوں میں سما کر اس خودرو جنگل کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دوڑ جائے۔"

یہ نثری نظمیں اور بعض بعد کے شاعروں کی نثری نظمیں اپنے طور پر اہمیت رکھتی ہیں لیکن ایک طویل عرصے کے بعد مبارک احمد کی ایک نثری نظم منظرِ عام پر آئی جو اردو کی نثری نظموں کے لیے سنگِ میل کا درجہ اختیار کر گئی۔ اس نثری نظم کا عنوان ہے "میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں"۔ اور یہ نثری نظم مبارک احمد کے شعری مجموعے (مطبوعہ ۱۹۶۵ء) میں شامل ہے:[1]

"میں نے زمین پر نیکی کا بیج بویا
اور آسمان سے مجھ پر عذاب نازل کیا گیا
پردہ جس نے بدی پھیلائی
اس پر رحمت کی بارش ہوئی
اور وہ معزز ٹھہرا
یوں سیاہ دور آیا
ظلم، تحکم، جبر اور فرار کے چور راہے میں آزادی کا بت نصب کیا گیا

[1] مبارک احمد "زمانہ عدالت نہیں" (لاہور: نئی مطبوعات، ۱۹۶۵) صفحہ ۸۰

لوگوں نے فرار کی آسان راہ اختیار کی اور غاروں میں چھپ گئے۔
کہ کتے پہرے پر ہیں
اور پھر عورتوں نے اپنے دائیں بازوؤں کی چوڑیاں توڑیں
اور بائیں بازوؤں کی چوڑیاں مردوں کو تحفے کے طور پر بھیج دیں
کہ وہ غاروں سے باہر نکل آئیں
پس غاروں سے شعلے نکلے
اندھیرے کے ماتھے پر روشنی کی تحریر بنے
اور میں نے دیکھا کہ دن پھرنے کو ہیں۔"

اس نثری نظم نے بہت سے شاعروں کو اس طرف مائل کیا اور مختلف رسائل میں کبھی کبھار نثری نظمیں چھپنے لگیں لیکن نثری نظموں کا سب سے پہلا مجموعہ "اپنے لیے اور دوستوں کے لیے نظمیں" ۱۹۷۴ء میں مطبع قوسین لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے مصنف عبدالرشید ہیں۔ اسی سال ہفت روزہ "نصرت" نے نثری نظم کا خصوصی پرچہ "غیر عروضی نظم نمبر" نکالا۔ رسالہ نگار کراچی میں ۱۹۷۴ء سے نثری نظم کے بارے میں مضامین تحریر ہونے شروع ہوئے۔ یہ سلسلہ وقفوں وقفوں سے اب تک جاری ہے۔ اسی طرح دیگر رسائل میں بھی نثری نظم کی نمائندگی ہونے لگی "نئی قدریں"، "سویرا"، "تحریریں"، "سیپ"، "ماہِ نو" وغیرہ رسائل میں نثری نظمیں شائع ہو رہی ہیں۔

عبدالرشید کے مجموعے کے بعد بھی کچھ مجموعے ایسے شائع ہوئے جن میں نثری نظمیں کلی یا جزوی طور پر شامل ہیں۔ فاطمہ حسن کی کتاب "بہتے ہوئے پھول" نثری نظموں پر مشتمل ہے اسے کراچی کے ایجوکیشنل پبلشرز نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ شائستہ حبیب کا مجموعہ "سورج پہ دستک" لاہور سے علیزہ پرنٹ والوں نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ کشور ناہید کے مجموعے "ملامتوں کے درمیان" میں بھی بہت سی نثری نظمیں ہیں۔ یہ مجموعہ مکتبۂ عالیہ، لاہور نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔ اسی سال جدید کلاسیک پبلشرز کراچی نے عذرا عباس کی طویل نثری نظم "نیند کی مسافتیں" شائع کی۔ انیس ناگی کے کلیات میں بھی بہت سی نثری نظمیں شامل ہیں۔ زاہد ڈار

کی "محبت اور مایوسی کی نظمیں"، اسد محمد خاں کی "کھڑکی بھر آسمان" رئیس فروغ کی "رات بہت تیز ہوا چلی" اور محمود کنور کی "دالکینو" بھی اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔ تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے ہمیں محض اتنا واضح کرنا ہے کہ نثری نظمیں رسائل سے آگے بڑھ کر مجموعوں کی صورت میں بھی شائع ہو رہی ہیں۔

موجودہ دور تک پہنچتے پہنچتے ہمارے یہاں اردو میں نثری نظم لکھنے والوں کی خاصی تعداد ہو چکی ہے۔ گویا نثری نظم مخالفت کے باوجود آگے بڑھی ہے۔ اس اسلوبِ شاعری کو اپنانے والوں میں بہت سے شاعر شامل ہیں جن میں سے بعض آٹھ دس سال قبل سے نثری نظم لکھ رہے ہیں اور بعض نووارد ہیں۔ ان میں مبارک احمد، قمر جمیل، محمد سلیم الرحمٰن، صلاح الدین محمود، عارف عبدالمتین، حفیظ صدیقی، عبدالرشید، افتخار جالب، انیس ناگی، فاطمہ حسن، کشور ناہید، شائستہ حبیب، انوپا حیدر، نسرین انجم بھٹی، طارق جامی، افضال احمد سید، رئیس فروغ، عذرا عباس، ثروت حسین، سیما خاں اور کنئی، سید جلیل ہاشمی، سعادت سعید، سید ساجد، تنویر انجم، گل صدیقی، روشن تحسین، تبسم کاشمیری، مسعود منور، مخدوم منور، جاوید شاہین، قمر تحسین، زاہد ڈار، احمد ہمیش، اقبال کوثر، محمود کنور، فہیم جوزی، زاہد مسعود، یحییٰ امجد، انور سن رائے، شوکت عابد، عباس اطہر، عمر علوی، روشن آرا نزہت، ایوب خاور، ناہید شاہد، محمد عظیم، ناہرہ صدیقی، اسد محمد خان اور بہت سے دوسرے نوجوان شامل ہیں۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ نثری نظم کے کھلے مخالفین کے قلم سے بھی اسی نوع کی تحریریں نکلی ہیں تاہم یہ تحریریں "نثرِ لطیف" کے زیرِ عنوان شائع ہوئی ہیں۔ وزیر آغا کی "عفریت"[1] اور "اے نرم رو پانی کے دھارے" اور انور سدید کی "غزال لمحہ"[2] اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں وزیر آغا اور انور سدید نے انھیں کبھی بھی نظم اور شاعری کے طور پر تسلیم نہیں کیا۔ بہرحال وزیر آغا کی "اے نرم رو پانی کے دھارے" بطورِ نمونہ ملاحظہ ہو:

---

[1] "اوراق" شمارہ ۱-۲ (جنوری، فروری ۱۹۷۶ء) ص ۶۹

[2] "اوراق" شمارہ ۴-۵ (اپریل، مئی ۱۹۷۵ء) ص ۲۰۶ تا ۲۰۸

Scanned by CamScanner

اے نرم رو پانی کے دھارے

ہم سب
تیرے کنارے، لرزتے ہوئے تنکوں کی طرح چپٹے ہوئے ہیں
ہم ننھی منی جانیں
ایک انوکھے ڈر میں مبتلا ہیں
ہمیں معلوم ہے کہ وہ تند سیلاب
جو پہاڑ کی دستار کے کھلنے
اور بادل کے آنچل کے چھٹ جانے کے باعث
اوپر سے نیچے اترنے والی ندیوں میں آگیا ہے۔
اب کوئی دم تک ہم تک پہنچنے والا ہے
پھر جب یہ سیلاب ہم تک پہنچا
تو اے نرم رو پانی کے دھارے
ہم کس طرح تمہارے کناروں سے چپٹے رہ سکیں گے
سیلاب آگیا
اس کی پہلی ہی غصیلی موج میرے کئی ساتھی تنکوں کو
کناروں سے نوچ کر بہالے گئی
مگر میں ابھی تک کنارے سے چمٹا ہوا ہوں
میرے ہونٹوں پر کف ہے اور میرا بدن
لرز رہا ہے
میں ہونے اور نہ ہونے کے بین درمیان کھڑا ہوں
بے بس تنکے، گزرتے ہوئے
میرے بدن کو چھوتے ہیں
اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں

Scanned by CamScanner

مجید امجد
راشد

شاید وہ ہوش میں نہیں ہیں
طوفانی تھپیڑوں نے انھیں ماؤف کر دیا ہے
مگر میں شعور کی نوک پر زندہ ہوں
اور لرز رہا ہوں
اور اپنے ساتھیوں کے انجام سے باخبر ہوں
اور جانتا ہوں کہ وہ انا کے خول کو عبور کر کے
سمندر کے بڑے خول میں جا رہے ہیں
اور ان کی روحیں ایک بڑے قید خانے میں
ابدی طور پر سکونت اختیار کرنے کو ہیں
مگر میں ابھی تک کنارے سے چمٹا ہوا
اپنے جسم کے بندی خانے میں زندہ ہوں
اور لرز رہا ہوں
اور سیلاب کی جھاگ نے میرے چہرے پر
اپنی مُہر ثبت کر دی ہے۔

یہاں ہم ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کرتے چلیں جو مجید امجد کی ان نظموں کے بارے میں بعض نثری نظم نگاروں (جیسے مثلاً عبدالرشید) کو ہے۔ جو نظمیں ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۴ء کے دوران میں لکھی گئیں۔[1] ان نظموں کو "نثری نظم" کی ذیل میں رکھتے ہوئے عصرِ حاضر میں لکھی جانیوالی نثری نظموں کا محرک قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات تو اپنے طور پر درست ہو سکتی ہے کہ مجید امجد کی نظموں سے نثری نظم نگاروں کو تحریک ملی ہو کیونکہ ان کا معروضی اور خارجی آہنگ نثر کے قریب ترین ہے لیکن مجید امجد کی نظموں کو "نثری نظم" کے زمرے میں شامل کرنا غلط ہے۔ مجید امجد کی نظموں کی تقطیع ارکان و زحافات کی بنیاد پر ممکن ہے۔ ان میں "فعلن فعلن" یا "فعل فعولن" کے وزن کا التزام کیا گیا ہے لہٰذا یہ آزاد نظمیں ہی ہیں۔ البتہ ن۔م۔ راشد نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں "دایاں بازو"

[1] "نصرت" شمارہ ۱۶۹ (۱۷ ستمبر ۱۹۷۴ء) صفحہ ۱۲

ادب "پیروڈی" کے نام سے دو تحریریں ایسی لکھی ہیں جو "نثری نظم" کی ذیل میں آتی ہیں۔ یہ نثری تخلیق "نیا دور" کراچی میں شائع ہوئیں۔ یہاں "دایاں بازو" نقل کی جاتی ہے: [۱]

ہم شام کو کھانا کھا رہے تھے
اچانک اس نے میرے گھر پر حملہ کر دیا
اس نے میرا دایاں بازو کاٹ ڈالا
بے شک میرے دائیں بازو میں درد رہتا تھا
وہ ہمارے بچوں کو اٹھا کر لے گیا
اب وہ کہہ رہا ہے تم یہ مان لو
تمہارا دایاں بازو نہیں ہے۔
"میں اس سائے کو کیا کروں
جو میرے جسم کے ساتھ پیوستہ ہے
دائیں بازو کے اس سائے کو؟
"تم یہ مان لو لکڑی کا بازو نہیں لگواؤ گے
دیکھنے کو نہ جینے کو

ورنہ

میں تمہارے بچوں کو کولھو میں پلوا دوں گا
لو، ہم نے مان لیا
ہم لکڑی کا بازو بھی نہیں لگوائیں گے
اس سے ہمیں مطلب ہی کیا؟
لیکن تم! تم تو اب بھی کانپ رہے ہو
ہا ہا ہا!
سردی سے

---

[۱] مخدوم منور، "نثری نظم کی تحریک" (کراچی: ایم۔ ایم پبلی کیشنز، ۱۹۷۹ء) صص ۵۳۔۵۶

Scanned by CamScanner

خوف سے ؟
دردِ عشق سے ؟
اور ایندھن کے ڈھیر کر کھنگال رہے ہو،
بار بار
شاید اسی کے نیچے لکڑی کا باز و چھپا ہو
تم کہہ رہے ہو
آؤ میرے ساتھ عمر بھر کی
دوستی کر لو
تمھاری بیوی میرے گھر میں ہمیشہ چکی پیسے گی
تمھاری جوان بیٹی میرے بستر پر سوئے گی
اور تم اپنی ہر فصل کاٹ کر
میرے گھر میں ڈال دیا کرو گے"
وہ یہ سب سرِ بازار کہہ رہا ہے
اور کوئی تماشائی بولتا تک نہیں.
تماشائیو! بولو
کل تمھاری باری آئے گی
میں اور میری بیوی اور جوان بیٹی
آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں
شاید وہیں وہ ہاتھ ہو
جو ہماری نظروں سے پوشیدہ رہا ہے
شاید اب بھی ...... شاید اب بھی ...... !

باقاعدہ طور پر وسیلۂ اظہار بنانے والوں میں منیر نیازی نے بھی دو ایک نثری نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نثری نظم ملاحظہ ہو:

Scanned by CamScanner

"حیرت کی منزل پر حسن کی نشانیاں"[1]

جیسے بارش ابھی ابھی تھمی ہے
ہوا ایسی ہے
کہیں کہیں سے، کبھی کبھی کسی کوئل کا نغمۂ مہجوری
شامِ بہار دروازے پر دستک دے رہی ہے
نئے نئے نکلے ستاروں
اور چاند کی چکا چوند میں الجھی ہوئی یہ شام بھی عجیب ہے ــــ

پاکستان کے ساتھ ساتھ نثری نظم ہندوستان میں بھی لکھی جا رہی ہے۔ بلراج کومل، مظفر احمد لاری، اور ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ نے نثری نظمیں لکھی ہیں۔ اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ نمونے کے طور پر محمد حسن کی ایک نثری نظم "گلوب" ملاحظہ ہو:[2]

"یہ بچے بھی عجیب ہیں
کل ہی نیا گلوب آیا تھا
اس کو فٹ بال بنا کر کھیلے
اور اس کے دونوں ٹکڑے الگ کر دیئے
اب جوڑتا ہوں تو چین کا سرا افریقہ سے جا ملتا ہے
انڈونیشیا کا چلی سے
بڑی محنت سے جوڑا بھی
تو سرے سخت ہو گئے
ایک سرا دوسرے سے ملنے کو تیار ہی نہ ہوا
آخر تنگ آ کر پھینک دیا
اب یہ دونوں ٹکڑے گویا بھیک کے پیالے ہیں

---

[1] منیر نیازی، "ماہِ منیر"، بار دوم (لاہور: مکتبۂ منیر، ۱۹۸۰ء) صفحہ ۴۵
[2] ڈاکٹر وہاب اشرفی، مرتب، رسالہ نئی قدریں (رانچی یونیورسٹی ہندوستان س۔ن) صفحہ ۱۱

جو کسی ایسے کی راہ دیکھ رہے ہیں جو انھیں جوڑ دے۔

نثری نظم کا ارتقائی مطالعہ اختتام کو پہنچا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم یہاں انکشاف کرتے ہیں کہ جیسے "آزاد نظم" کے بعد "آزاد غزل" پیدا ہوئی ویسے ہی "نثری نظم" کے بعد "نثری غزل" بھی معرضِ وجود میں آچکی ہے۔ اس کے "موجد" مشتاق باسط ہیں۔ جو ان دنوں پنجاب کے ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تحصیل گوجرہ میں ریذیڈنٹ مجسٹریٹ کے طور پر تعینات ہیں۔ "نثری غزل" کے لیے ان کے پاس کم و بیش وہی دلائل ہیں جو "نثری نظم" کا جواز بنتے ہیں ان کے خیال میں "نثری نظم" اگر شاعرانہ خیالات کی بہ شکل اکائی مظہر ہے تو "نثری غزل" شاعرانہ خیالات کے مختلف FLASHES کا گلدستہ ہے جو "نثری نظم" ہی کی طرح خارجی یا معروضی آہنگ کی پابند نہیں۔ اس ضمن میں ہمارا موقف یہ ہے کہ غزل کی شناخت اوزان و بحور مخصوص ترتیبِ قوافی، مطلع، اشعار اور مقطع کے حوالے سے ہوتی ہے۔ جب کہ نظم کی کوئی متعین صورت نہیں سوائے اس کے کہ وہ داخلی طور پر وحدت و کلیت کی حامل ہو چنانچہ نظم تو مختلف شکلوں کی ہو سکتی ہے۔ لیکن غزل کے لیے ایسا ہونا کچھ غیر مناسب سا محسوس ہوتا ہے۔ بہر حال دیکھئے آگے چل کر یہ تجربہ کیا گل کھلاتا ہے۔ فی الحال تو ہمیں "نثری غزل" کے "نثری اشعار" "اقوالِ زریں" قسم کی چیز معلوم ہوتے ہیں۔ اور ہر "نثری شعر" کو پڑھ یا سن کر "اطلاع کا شکریہ" کہنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ بھی ایک "نثری غزل" دیکھئے:

ورق ورق بکھرے لفظ تاریخ کی تصویر کشی کرتے ہیں
جب کہ لحظہ لحظہ سانس لیتی زندگی تاریخ کو بدلتی رہتی ہے

تصور اور جاگتے خواب بہت خوش آئند ہوتے ہیں
مگر زندگی ان دونوں سے مختلف رویے رکھتی ہے

خزاں کا موسم نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے مگر غور کیا جائے
تو زرد پتے آنے والی بہاروں کا پیغام دیتے ہیں

سیلاب فصلوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں!
مگر آنے والے موسموں میں زمینیں زرخیز ہو جاتی ہیں

Scanned by CamScanner

چھوٹے چھوٹے بے وجود خوف ہماری زندگیوں کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں
جبکہ بڑے بڑے المیے ہم کو ادراکِ حیات دیتے ہیں۔

نثری غزل کا قصہ بھی تمام ہُوا۔ ہمارا موضوع چونکہ نثری نظم ہے اس لیے ہم آخر میں نثری نظم ہی کے سلسلے میں حاصلِ کلام کے طور پر یہ کہیں گے کہ موجودہ سال تک پہنچتے پہنچتے نثری نظم کافی آگے بڑھ چکی ہے۔ اُردو میں نثری نظم لکھنے کا رجحان، نوجوانوں میں پیدا ہو چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ صنفِ شاعری ہمارے ہاں قارئین میں کہاں تک مقبولیت حاصل کرتی ہے۔ پاکستان میں نثری نظم بہت لکھی جا رہی ہے۔ اس میں اچھی شاعری ہُوئی بھی ہے، اور نہیں بھی ہُوئی۔ بہرحال اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ اس کے ارتقاء کے امکانات روشن ہو سکیں۔

Scanned by CamScanner

کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ ایک ن۔م۔ راشد اور دوسرے مجید امجد۔

ن۔م۔ راشد نے اُردو شاعری کو جن شعری مجموعوں سے نوازا، ان میں ماورا، ایران میں اجنبی، لا=انسان اور گماں کا ممکن شامل ہیں۔ ان سب میں آزاد نظمیں موجود ہیں۔ یہ آزاد نظمیں بالکل سادہ انداز کی بھی ہیں اور جمالیاتی خصائص سے معمور بھی۔ راشد نے خوبصورت تراکیب اور اندرونی قوافی INNER RHYMES کے استعمال سے صوتی حُسن بھی پیدا کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ایک خوبصورت نظم "زنجیر" ملاحظہ ہو:[1]

گوشۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگِ خارا ہی سہی، خارِ مغیلاں ہی سہی
دشمنِ جاں، دشمنِ جاں ہی سہی —
دوست سے دست و گریباں ہی سہی۔
یہ بھی تو شبنم نہیں —
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں —
ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکلا
وہ حسیں اور دُور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسنِ روز افزوں کی زینت کے لیے
سالہا بے دست و پا ہو کر بُنے ہیں تار ہائے سیم و زر
اُن کے مردوں کے لیے بھی آج اک سنگین جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال!
شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں

---

[1] "ایران میں اجنبی" (لاہور: گوشۂ ادب، ۱۹۵۷ء) ص ۱۰۲-۱۰۴